IQBAL REVIEW (64: 1)
(January – March 2023)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

کلامِ اقبال میں تصوّرِ عقل و عشق: ایک مطالعہ

لطیف صارم

ABSTRACT

In this article, the author explores the concepts of reason (*Aqal)* and love (*Ishq)* in the poetry and philosophy of Allama Iqbal. Iqbal, a renowned philosopher and poet of the 20th century, deeply integrated the themes of spirituality, self-realization, and intellectualism into his works. The study examines Iqbal's belief in the supremacy of reason (*Ishq*) over love (*Aqal*), asserting that while reason tends to focus on worldly calculations, love (*Ishq)* transcends material limitations and drives humanity toward higher spiritual and existential goals. The article contrasts Iqbal's understanding of love (*Ishq*) with previous Urdu and Persian poets, who often portrayed love (*Ishq*) as leading to suffering and madness. Iqbal redefines it as a force of life, continuity, and action. For him, love (*Ishq*) is the ultimate creative power of the universe, the source of all progress, and the essential fuel for personal and collective growth. In opposition to reason (*Aqal*), which can lead to hesitation and doubt, love (*Ishq*) brings certainty, passion, and the strength to pursue truth and self-realization without fear. Additionally, the article delves into the philosophical dualism of love (*Ishq*) and reason (*Aqal*), highlighting how Iqbal values both but emphasizes the spiritual completeness and eternal wisdom that love (*Ishq*) offers. Through his poetry, Iqbal encourages Muslims to embrace love (*Ishq*) as a transformative force to reclaim their past glory and

reach new heights of success and enlightenment. Ultimately, Iqbal's concept of love (*Ishq*) promotes perseverance, self-actualization, and an active struggle for higher ideals, positioning it as the driving force behind all human achievement and universal harmony.

ڈاکٹر علاّمہ محمد اقبال بیسویں صدی کے نہ صرف بڑے شاعر تھے بل کہ ایک مفکّر اور فلسفی بھی تھے۔ علاّمہ محمد اقبال کی تعلیم و تربیت ایک مذہبی ماحول میں ہوئی۔ عبدالسلام ندوی اپنی کتاب "اقبال کامل" میں ڈاکٹر صاحب کا اپنا بیان نقل کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، ان کے والد گرامی اپنے اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر آتے اور انھیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو وہ اقبال کے پاس سے گزرے تو فرمایا بیٹا جب تم قرآن مجید پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تمہی پر اُترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تم سے ہم کلام ہے۔[1]

اس بات کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک شعر میں بھی کیا ہے۔ وُہ فرماتے ہیں کہ:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشُا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف[2]

علاّمہ اقبال میں بچپن سے ہی شعر و سخن کا ایک فطری رجحان موجود تھا جسے سید میر حسن جیسے مشفق و مربّی اُستاد نے اقبال کی شعری صلاحیتوں کو جِلا بخشی۔ سید میر حسن نے اقبال میں اسلامی فکر کی جو شمع فروزاں کی تھی اُس کی لو زمانے کی تند و تیز آندھیاں چلنے کے باوجود کبھی مدھم نہ ہوئی بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کی اسلام سے محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔

علاّمہ محمد اقبال بیسویں صدی کی اُردو شاعری کے اُفق پر ایک نمائندہ شاعر کی حیثیت سے اُبھرے۔ اُنھوں نے اپنے مختلف الجہات افکار و تصوّرات سے اُردو شاعری کے دامن کو نہ صرف وُسعت عطا کی بل کہ شاعری کی دُنیا کو ایک نئی جِلا بخشی۔ وُہ اپنے افکار و تصوّرات کی بنا پر اپنے ہم عصر شعرا میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جو مختلف افکار و تصوّرات پیش کیے اُن میں اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں جیسے اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری میں سرزمینِ ہندوستان سے محبت کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ترانۂ ہندی، تصویرِ درد اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جیسی نظموں میں حُب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبات واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ گئے تو جذبہ وطنیت کے بجائے اُن کے باطن میں پہلے سے موجود جذبۂ ملی اجاگر ہونے لگا۔ اقبال کے مختلف تصوّرات و افکار میں تصوّرِ خودی و بے خودی، تصوّرِ عشق، تصوّرِ عقل، مردِ کامل، نظریہ فن، نظریہ تصوّف اور تصوّرِ تعلیم کے علاوہ اشتراکیت، فاشزم اور جمہوریت کے بارے میں تصوّرات نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔

تصوّرِ عشق اقبال کے اہم تصوّرات میں شمار ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اقبال کی شاعری میں تصوّرِ عشق وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمتِ ازلی ہے۔ کلامِ اقبال میں جس قدر عشق اور اس کے مترادفات کا ذکر تکرار اور شدّتِ احساس کے ساتھ ملتا ہے اتنی شدّت سے کسی اور موضوع کا ذکر نہیں ملتا۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک طاقتور اور قوّی جذبہ ہے۔ عشق کی بے انتہا وُسعتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال نے عشق کے متبادل جنوں، شوق، جذبِ دروں، وجدان، دل، آرزو، سوز، محبت، سرمستی، یقین، خودی اور فقر جیسے الفاظ و تراکیب مترادفات کے طور پر استعمال کی ہیں۔ اقبال کے تصوّرِ عشق کے بارے میں خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک عشق کون و مکاں کی تخلیق کا باعث ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے سائنسی اور تحقیقی کارنامے اور علوم و فنون کے معجزے عشق ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ کائنات کی رنگینی و رعنائی، تب و تاب اور استحکام و توانائی اسی کے دم قدم سے ہیں۔[۳]

شعرا میں سے کسی نے محبّت کو لطیف ترین حِس کا نام دیا ہے اور کسی نے محبّت کو نورِ معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ محبّت کو اِقبال ایک نظم "محبّت" میں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

عروسِ شب کی زُلفیں تھیں ابھی نا آشنا خَم سے
ستارے آسمان کے بے خبر تھے لذّتِ رَم سے
قمر اپنے لباسِ نَو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زُلفِ برہم سے[۴]

اگر اقبال کی شاعری کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے ہاں عشق کا تصوّر اُن کے پیش رو شعرا سے مختلف ہے۔ اُن کے پیش رووں نے عشق کو اپنے ذاتی تاثرات و تجربات کی صورت میں عشق کی کیفیات بیان کی ہیں جب کہ اقبال نے ذاتی تاثرات سے ہٹ کر کے عام زندگی میں عشق کا تعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال سے قبل کی اُردو فارسی شاعری میں عشق کا مقام و مرتبہ پست اور کم

تر دکھائی دیتا ہے۔ عاشق دَر دَر کی ٹھوکریں کھا کھا کر دیوانہ و مجنوں بن جاتا ہے، عشق کے مصائب و آلام کی چکی میں پِستا ہوا دکھائی دیتا ہے، جیسے خدائے سخن میر تقی میر کہتے ہیں کہ:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا[۵]

ایک اور مقام پر میر تقی میر کہتے ہیں کہ:

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لا یا[۶]

اسی طرح مرزا اسد اللہ خان غالب بھی عشق کو دماغ کا خلل کہہ اُٹھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا[۷]

غالب مزید کہتے ہیں کہ:

عشق نے، غالب، نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے[۸]

اقبال سے قبل شاعری میں عاشق کو ناکام و نامراد قرار دیا گیا ہے۔ گویا راہِ عشق میں درپیش مصائب و آلام اور تکالیف سے مایوسی و نااُمیدی پیدا ہوتی ہے یعنی عشق خواری و موت، بدنامی اور ذلّت و رُسوائی کا سبب بنتا ہے۔ جب ہم اقبال کے تصوّرِ عشق پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اقبال کے ہاں عشق موت کا باعث بننے کے بجائے زندگی کی علامت، زندگی کا ضامن اور جہدِ مسلسل کے طور پر کار فرما نظر آتا ہے۔ اقبال اپنی نظم "عشق اور موت" میں اس بات کے قائل ہیں کہ عشق موت نہیں لاتا، بل کہ عشق زندگی کا پیام بر ہے، وُہ فرماتے ہیں کہ:

سُنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اُس کے لب پر ہوئی آشکارا
بقا کو جو دیکھا فنا ہوگئی وُہ
قضا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وُہ[۹]

تصوّف میں "عشق مجازی" اور "عشقِ حقیقی" جیسی دو اصطلاحات استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ عشق مجازی کا تعلق اسی مادی دنیا سے ہوتا ہے جب کہ عشق حقیقی کا تعلق اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے، دوسرے لفظوں میں روحانی حقائق سے ہوتا ہے۔ عشق مجاز یسے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک مجاز سے دل لگانے اور اس میں خود کو فنا کر دینے کا نام عشقِ حقیقی ہے۔ وُہ عشق مجازی کو عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں جب کہ اقبال اس نظریہ کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال نے تصوّرِ عشق کا ایسا نظریہ پیش کیا جس سے انسان میں کسی مقام و مرتبہ کے حصول کے لیے عزمِ صمیم، جہدِ مسلسل اور تڑپ پیدا ہو۔ جیسے اقبال نے وَلولے، جذبے اور ذوق و لگن سے خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی مسلم قوم کو بیدار کیا، مردہ دلوں میں ترقی کی طرف گامزن کرنے اور اپنا کھویا ہوا مقام و مرتبہ حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کی۔ اقبال مسلمانوں کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرتے ہوئے بانگِ درا میں فرماتے ہیں کہ:

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے
سرّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی[۱۰]

اقبال نے تصوّرِ عشق کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وُہ عقل یا علم پر عشق یا دِل کی برتری کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک عشق آگہی اور خود آگہی کا منبع ہے۔ عقل کسی بھی معاملے کے سُود و زیاں میں اُلجھتی رہتی ہے اور حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے برعکس عشق نفع و نقصان میں پڑے بغیر وُہ کام کر گزرتا ہے جسے وُہ کرنا چاہتا ہے، اس طرح وُہ حقیقت کو پالیتا ہے۔ اقبال بانگِ درا میں فرماتے ہیں کہ:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[۱۱]

اقبال علما ور عشق کا موازنہ ضربِ کلیم میں شامل نظم "علم و عشق" میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب[۱۲]

درج بالا اشعار سے اقبال کی عشق کی عقل پر برتری ظاہر ہو رہی ہے۔ اقبال کی فکر کے مطابق حق شناسی کے لیے عقل کے بجائے عشق زیادہ کارگر اور سُود مند ہوتا ہے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ:

وُہ [اقبال] عقل کے کلیۃً مخالف نہیں، البتہ جب عقل عشق سے بالکل علاحدگی اختیار کر لیتی ہے تو وُہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور عشق کو ہر جگہ ترجیح دیتے ہیں۔ [۱۳]

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اقبال علم و عقل کے دشمن ہیں؛ وُہ علم و عقل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ انسانی زندگی کی مادی ترقی علم و عقل کی رہینِ منت ہے اور روحانی ترقی عشق کی رہبری سے ممکن ہو سکتی ہے اور یہی روحانی ترقی اقبال کے ہاں انسانی زندگی کا اصل منتہا و مقصود ہے، اِقبال بالِ جبریل میں فرماتے ہیں کہ:

خِرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سِکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ [۱۴]

اقبال بانگِ درا میں شامل اپنی نظم "فلسفۂ غم" میں اپنے تصوّرِ عقل اور تصوّرِ عشق میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے، تا اَبد پائندہ ہے
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی [۱۵]

اگر اقبال کے تصوّرِ عقل و عشق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان دونوں میں کچھ زیادہ امتیاز نظر نہیں آتا کیوں کہ عقل میں جب سوز پیدا ہوتا ہے تو عقل عشق بن جاتا ہے۔ اقبال کے پیش رو مولانا روم فلسفے اور تصوّف کے اسرار و رموز سے بخوبی آشنا تھے۔ علاّمہ اقبال مولانا روم کو مرشد تسلیم کرتے ہیں، یقیناً مولانا کے اثرات اقبال کی شاعری پر بھی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

رومی کے کلام میں عقل و عشق کی آمیزش بھی ہے اور آویزش بھی، یہی حال اقبال کا ہے۔ اس کے ہاں بھی عقل و عشق اور دین و دانش کہیں باہم معاون نظر آتے ہیں اور کہیں ایک دوسرے کے حریف۔[۱۶]

اگر کلامِ اقبال میں عقل و عشق کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عقل انسان کی عملی طاقت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے بجائے اس کے انتشار کا موجب بنتی ہے جب کہ عشق میں سادگی پائی جاتی ہے۔ اقبال عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

عقل عیّار ہے، سو بھیس بنالیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم[۱۷]

اقبال کا نظریہ عشق، بانگِ درا میں موجود نظم "پیامِ عشق" سے واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے کہ عشق انقلاب اور ارتقا کا نام ہے۔ اقبال پیامِ عشق میں فرماتے ہیں کہ:

سُن اے طلب گارِ دردِ پہلو، میں ناز ہوں تُو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دِل کا ہوں، تُو سراپا ایاز ہو جا[۱۸]

اقبال کی خواہش کہ مسلمان ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی آرزوؤں کو جواں رکھیں تاکہ مسلم اُمہ ترقی کی طرف گامزن ہو سکے۔ عشق کی بدولت ہی ملتِ اسلامیہ میں فروغ و ترقی ہو سکتی ہے۔ اس جذبۂ عشق کا پیغام دیتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں کہ:

گئے وُہ ایّام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نَوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا[۱۹]

اقبال کے نزدیک تصوّرِ عشق وُہ جذبہ ہے جس سے کائنات کو مسخّر کیا جا سکتا ہے لہٰذا کائنات کی تسخیر کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ترقی و خوش حالی پر قناعت پسند نہیں ہونا چاہیے بل کہ اپنی ترقی و خوش حالی کے لیے آرزوؤں اور خواہشات کو محدود نہ کریں۔ اقبال بانگِ درا میں شامل ایک نظم "شمع اور شاعر" میں کہتے ہیں کہ:

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے[۲۰]

اقبال مسلمانوں کے اندر عزمِ صمیم، ذوق و شوق، جہدِ مسلسل اور اُن میں آگے بڑھنے کی تڑپ اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ وُہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ ماند پڑ گیا تو پھر مسلمان اپنا وجود ہی کھو دیں گے۔ بالِ جبریل کی نظم "ساقی نامہ" میں فرماتے ہیں کہ:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے[۲۱]

اقبال کا تصوّرِ عشق ایک وسیع معنی و مفہوم کا حامل تصوّر ہے جسے چند اوراق میں سمیٹنا انتہائی مشکل کام ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا تصوّرِ عشق اپنے پیش رو شعرا کے تصوّرِ عشق سے مختلف اور منفرد ہے۔ اُن کی نظر میں عشق ذِلّتوں رُسوائی، موت و فنا، مایوسی و نا اُمیدی اور خواری کا نام ہے؛ جب کہ اقبال کے ہاں عشق نام ہے زندگی کی ضمانت کا، عشق نام ہے زندگی کے پیام بر، بلند نظری، حقیقت شناسی اور ایک طاقت ور جذبے کا۔ عشق، عمل سے سرشاری اور حصولِ مقصد کے لیے جذبہ و لگن، عزمِ صمیم اور جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱ عبدالسلام، ندوی، "اقبالِ کامل"، لاہور: بُک ٹاک، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴

۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، "کُلّیاتِ اقبال اُردو"، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۴۰۶

۳ محمد زکریا، خواجہ، [مدیرِ عمومی]، "مختصر تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، اُردو اَدب [آغاز تا بیسویں صدی]، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، اشاعت اوّل، ۲۰۱۶ء، ص ۵۳۸

۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، "کُلّیاتِ اقبال اُردو"، ص ۱۳۷

۵ عبدالحق، مولوی، "انتخاب کلامِ میر" [مرتب]، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۵۸

۶ ایضاً، ص ۶۳

۷ مرزا اسداللہ خان غالب، "دیوانِ غالب" [مرتب: امتیاز علی خان عرشی]، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طباعت دوم، دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۲

۸ ایضاً، ص ۳۳۶

۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، "کُلّیاتِ اقبال اُردو"، ص ۹۰

[۱۰] ایضاً ، ص ۲۸۷

[۱۱] ایضاً، ص ۳۱۰

[۱۲] ایضاً، ص ۵۳۳

[۱۳] عبد السلام، ندوی، "اقبال کامل"، ص ۲۷۷

[۱۴] محمد اقبال، ڈاکٹر، "کُلّیاتِ اقبال اُردو"، ص ۳۸۵

[۱۵] ایضاً ، ص ۱۸۳

[۱۶] عبد الحکیم، خلیفہ، "فکرِ اقبال"، لاہور: بزمِ اقبال، ایڈیشن دہم، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۲۷۱

[۱۷] محمد اقبال، ڈاکٹر، "کُلّیاتِ اقبال اُردو"، ص ۳۹۳

[۱۸] ایضاً ، ص ۱۵۵

[۱۹] ایضاً ، ص ۱۵۶

[۲۰] ایضاً، ص ۲۲۱

[۲۱] ایضاً، ص ۴۵۱